ڈاکٹر اقلیمہ ناز
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو زبان و ادب، فاطمہ جناح ویمن یونی ورسٹی، راولپنڈی
ڈاکٹر محمد بلال
لیکچرر اردو
گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج فار بوائز، چکری، راولپنڈی

مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں تغیر پذیر سماجی اقدار

ABSTRACT

Variable of Social Values in the Short Stories of Mirza Hamid Baig
By Dr. Aqlima Naz, Assistant Professor, Department of Urdu Language and Literature, Fatima Jinnah Women University, Rawalpindi.
Dr. Muhammad Bilal, Lecturer Urdu, Govt. Associate College for Boys, Chakri, Rawalpindi

Literature and society have a strong relationship with each other. Changes in society also lead to changes in literature. Mirza Hamid Baig is well Known Short Story writer of the era. He is a keen observer of society and notices that society's values are changing day by day, and ultimately it may take place in the form of destruction in society. Ethical and moral values are the guidelines from that a person determines his right path to live in peace and harmony. He expresses his fear in the form of short stories that a man in the modern age has forgotten common manners, proper etiquette and respect for each other. Mirza Hamid Baig started writing short stories in the seventh decade of 20th century. He has written four short stories books namely "Gumshuda kalimaat","Jaankibaai ki arzi", "Gunah ki mazdoori", "Taar per chalny wali". This article "Variable of Social Values in The Short Stories of Mirza Hamid Baig" aims to describe the importance of values in a society and the deterioration of values have negative impact on individual's life and in modern society.

Keywords: Society, Values, Mirza Hamid Baig, Short tories, Ethics

ادب اور سماج کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ سماج میں ہونے والا تغیر و تبدل ادب میں بھی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ سماج بنتا کیسے ہے؟ تو سماج دراصل مختلف انسانی گروہوں کے اعمال و افعال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انسان

اچھے اعمال، افکار اور حرکات سے سماج میں امن وآشتی اور خوشحالی پیدا کر سکتے ہیں جبکہ بُرے کام سماج میں بدحالی، انتشار اور سماجی نظام درہم برہم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اسی طرح سماج اپنے انسانوں کے لیے کچھ اصول وضوابط، اقدار و روایات اور پابندیاں عائد کرتے ہیں جن کی پاسداری سے ہی سماجی نظام میں امن وامان قائم رہ سکتا ہے، ورنہ روگردانی سے سماجی نظام زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور جب سماجی نظام توڑ پھوڑ اور زوال پذیر ہوگا تو ادب میں بھی اس کے واضح اثرات رونما ہوں گے۔

ایک حساس ادیب سماج سے نظریں چرا کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی ہے تو اس کا تخلیق کردہ فن پارہ تا دیر دم خم نہیں رکھتا۔ ادیب سماجی حقیقتوں کو اپنی تخلیق کے ذریعے نہ صرف منعکس کرتا ہے بلکہ اس کی از سرِ نو تخلیق بھی کرتا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے اپنے سماجی نظام، ماحول اور معاشرے کے اثرات قبول کرتے ہوئے افسانے کے ذریعے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مرزا حامد بیگ بھی اردو افسانہ نگاری کی ایک ایسی ہی معتبر شخصیت ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں کا خمیر اپنے اردگرد کے ماحول سے تیار کیا۔ ان کے افسانوں میں سماج میں بدلتی ہوئی اقدار کا نوحہ دکھائی دیتا ہے۔

ستر کی دہائی کے لگ بھگ مرزا حامد بیگ نے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ یہ وہ دور ہے جب افسانے نے فکر کی کئی منازل طے کیں، مرزا حامد بیگ نے بھی اپنے عہد کی مجموعی صورتِ حال کو فکری سطح پر افسانے کے ذریعے پیش کیا۔ وہ اپنے خطے کی تہذیبی اقدار سے والہانہ لگاؤ رکھنے کی بنا پر ہمیں مغربی معاشرے سے پاک اپنے خطے کے تہذیبی ورثے کی یادوں میں شامل کرتے ہیں۔ اور اُس دور میں لے جاتے ہیں جب یہاں مغلیہ تہذیب کی شان وشوکت اور جاہ وحشمت تھی مگر برصغیر کے لوگ ملوکیت کے زیرِ اثر اپنے قیمتی تہذیبی ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کے افسانوں میں اقدار کی ٹوٹ پھوٹ اور قول وفعل کا تضاد فرد کی داخلی کیفیات کے بہترین ترجمان بن جاتے ہیں۔ ایسے میں فرد خارجی ماحول سے بیزار داخل کی دنیا میں پناہ لینے میں ہی عافیت تصور کرنے لگتا ہے۔ ادیب چوں کہ سماجی تناظر میں اپنی فکر اور فن متعین کرتا ہے تو ایسے میں مرزا حامد بیگ بھی سماجی اظہار کے کرب سے دوچار نظر آتے ہیں۔ مظفر علی سید اس حوالے سے کہتے ہیں۔

> مرزا حامد بیگ کے افسانے خط مستقیم میں نہیں چلتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار کو عصری صورت حال میں کوئی سیدھا راستہ نظر نہیں آتا یا اس کے کردار زندگی کے پیچ وخم اور اس سے بھی زیادہ اپنے ہی توہمات میں الجھ کر رہ گئے ہیں...(۱)

تقسیمِ ہندوستان کے سانحے سے ابھی لوگ جانبر نہیں ہوئے تھے کہ مشرقی پاکستان کے وقوعے نے سماجی اقدار کا نظام اتھل پتھل کر دیا۔ معاشرہ جس تیزی سے اخلاقی بحران کی جانب اڑان بھر رہا تھا، سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد تو مجموعی اخلاقی حالت مزید بدتر ہوتی چلی گئی۔ ستر کی دہائی کے بہت سے افسانہ نگار اپنی تخلیقات میں اس تغیر پذیر سماجی ڈھانچے کو بیان کر رہے تھے۔ مرزا حامد بیگ کے نزدیک ان افسانہ نگاروں کے سامنے اظہار کی دو راہیں تھیں جن پر چل کر وہ اپنے فن کی راہیں متعین کر رہے تھے۔

> زوال ڈھاکہ ... یہ ایک ایسی روحانی واردات تھی جو ستر کی دہائی کے افسانہ نگار کو مقامِ حیرت تک لے آئی۔اب ہم لوگوں کے سامنے دو ہی راستے تھے،یعنی یا تو ہم اپنے سینیئرز کے تتبع میں لکھتے اور ان کے CAMP FOLLOWERS شمار کیے جاتے اور یا پھر یہ صورت تھی کہ پرانے سٹرکچرل ڈھانچے کا انہدام کریں۔سو ہم لوگوں نے یہی دوسری راہ اپنائی۔(۲)

چنانچہ مرزا حامد بیگ افسانہ نگاروں کی اس صف میں شامل ہوئے جنھوں نے افسانے کے اسٹرکچر کو توڑ کر نئی فکر اور احساس کو فروغ دیا۔فکر وفن کے نئے نئے تجربات کیے اور افسانوں میں اظہار کے نئے طریقے وضع کر کے معنوی تہہ داری پیدا کی۔

اشیا جب اپنے مرکز سے دور ہونے لگتی ہیں تو اپنا توازن کھو بیٹھتی ہیں۔اسی طرح جب تہذیب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہے تو فرد بھی بھرے معاشرے میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے، وہ اپنی ذات میں گم ہو کر انفعالیت پسند ہو جاتا ہے۔ مرزا حامد بیگ نے فرد کی اس ازلی تنہائی کو دیکھا،محسوس کیا اور اس تنہائی کے محرکات کو تلاش کیا۔

> مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں جو کہانی پیدا ہوتی ہے وہ یادوں اور یادداشتوں کی کہانی ہے۔ایک ایسے انسانی حافظے کی کہانی ہے جس پر گزرے وقتوں کی یادیں لکھی ہوئی ہیں۔(۳)

انھوں نے سماج میں پنپنے والے منفی انسانی روّیوں مثلاً جھوٹ،لالچ،حرص،منافقت،نفرت اور خود غرضی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔خاص طور پر مغلیہ تہذیب کی شکست وریخت نے انھیں بہت متاثر کیا۔اس تہذیب کی بازگشت بار بار ان کے افسانوں میں دکھائی اور سنائی دیتی ہے۔کہیں تہذیبی رکھ رکھاؤ کی صورت میں تو کہیں شاہانہ طرزِ زندگی کی طرز پر، بارہ دریاں،مغل شہزادے،مغل عمارتیں اس دور کی یادیں تازہ کر دیتی ہیں۔جیلانی کامران کے بقول۔

> انسانوں کے اعتبار سے گم ہو جانے کا خطرہ،جیسا مرزا حامد بیگ کی کہانی سے مغلوں کو درپیش ہے ویسا ہی خطرہ ہم سب کو ہے کہ کہیں ہم انسان کے طور پر باقی نہ رہیں۔اور ان اچھی یادداشتوں سے بے خبر ہو جائیں جو آدمی کو زمان ومکان میں زندہ رہنا سکھاتی ہیں اور زمین پر ایک اچھی دنیا کو پیدا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔(۴)

مرزا حامد بیگ کے افسانے ''زمین جاگتی ہے'' کی کہانی ایک اندھے کنویں کے گرد گھومتی ہے۔ایک ایسا اندھا کنواں جس کا بظاہر تو پانی خشک ہو چکا ہے مگر حرص و ہوس کے پجاریوں کو کنویں میں پانی چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔کنویں میں بہت زیادہ اندھیرا اور گھٹن ہے، دور دور تک اس میں کہیں بھی پانی نظر نہیں آتا،کنکر پھینکنے سے بھی انھیں آواز نہیں آتی مگر وہ اس بات پر مصر ہیں کہ نیچے گہرائی میں پانی کے دریا بہہ رہے ہیں اور اس میں موجود سونا انھیں کسی طور نکالنا ہے۔دو کنویں میں نیچے

گئے ہوئے ہیں اور لالچ کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں اور دو کنویں میں اترتے ہوئے مختلف وسوسوں اور کشمکش کا شکار ہیں جبکہ دو آدمی شہر کی طرف مزید دو قابلِ اعتبار اشخاص کی تلاش میں نکلے ہیں تا کہ تمام مل کر کنویں سے ایسا سونا نکال سکیں جس کے بارے میں انھیں خود بھی معلوم نہیں کہ آیا کنویں میں سونا موجود بھی ہے کہ نہیں۔ مگر حرص و ہوس اور لالچ نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی ہیں، ان کی آنکھوں میں گویا سانپ کی آنکھیں موجود ہیں۔

''اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے اور ہر طرف سناٹا ہے۔

''سن رہے ہو۔ کنویں میں سے چلتے پانی کی آواز آ رہی ہے، جیسے دریا بہتا ہو۔''

''لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔''

''ہاں کبھی نہیں۔''

دونوں ایک بار پھر اندھے کنویں کی منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

''وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔''

''ہاں، اگر بہت جلدی بھی پہنچیں تو آدھی رات سے پہلے کیا پہنچیں گے۔''

وہ سیدھے ہو کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، ان کی آنکھوں میں سانپ کی آنکھیں ہیں۔''(۵)

اپنی اقدار کی پاسداری کی بجائے، کم اور حلال پر اکتفا کرنے کی بجائے مال و متاع کے حریص اس معاشرے میں ہر طرف نظر آتے ہیں، افسانہ نگار نے اس افسانے کے ذریعے علامتی انداز میں ایسے اشخاص کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو زیادہ کی لالچ میں خود کو اندھے کنویں میں جھونکنے سے بھی باز نہیں آتے اور انجام کار اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

قدروں کے زوال کی صورتِ حال سے جس طرح آج کا لکھنے والا دوچار ہوا ہے، شعور کی آنکھ نے یہ منظر دیکھے نہ تھے، بنجر شباہتوں کی دہلیز پر ہر شے پہچان کے لبادے اتار چکی ہے کہ آمریت پسندی نے خوف و دہشت کے جن صحراؤں کو ذہن کی وادیوں میں دھکیل دیا ہے یہی پرانے رویوں سے بغاوت کے ایک نئے رجحان کی علامت بھی بنا۔(۶)

مرزا حامد بیگ نے ''کالی زبان'' افسانے میں اس ایسے لوگوں کی عبرتناک زندگی کا نقشہ کھینچا ہے جو دنیا کی آسائشوں کے حصول کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ہی دھن میں مگن انجام سے بےخبر معصوم اور ایماندار لوگوں کو اس حد تک اپنے فریب کے جال میں پھنسا لیتے ہیں کہ ان نیک طینت لوگوں کی زندگی تو اجڑ ہی جاتی ہے مگر خود بھی بےسکون رہتے ہیں۔ مگر ایک نہ ایک دن اپنے برے اعمال کی سزا پا ہی لیتے ہیں۔ ابونواس اس افسانے کا مرکزی کردار جسے اپنی چچا کی بیٹی سے سچا عشق ہے اور رشتہ مانگنے پر چچا نے یہ شرط رکھی کہ قبیلہ بنی بکر کی سب سے تیز رفتار گھوڑی ''شبکہ'' حق

مہر میں دی جائے۔ چنانچہ وہ اس گھوڑی کے مالک ابی طاہر نامی شخص کے گھر کسی طور پہنچ کر وہاں سے گھوڑی کو راتوں رات بھگا کر لے آتا ہے۔ ابی طاہر خود اور اس کے بندے اس کا دور تک پیچھا کرتے ہیں۔ باقی افراد تو تھک ہار کر راستے سے واپس چلے جاتے ہیں مگر ابی طاہر اپنی گھوڑی واپس لانے کے لیے ہمت و حوصلے کو مجتمع کر کے اس پر مسلسل تلوار سے وار کرتا جاتا ہے مگر ابھی تک ابی طاہر کو گھوڑی باز یافت کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ ابونواس اپنے عشق میں اس قدر دیوانہ ہو چکا ہے کہ اب وہ اس موقع پر اپنی محبت کے حصول کی خاطر تمام اخلاقی اور انسانی اقدار کو پامال کر کے جھوٹ اور مکر کا جال بنتا ہے تا کہ ابی طاہر سے جان چھڑائی جا سکے۔ وہ ابی طاہر سے کہتا ہے۔

> گھوڑی اور عورت اُس کی، جس کے نیچے... رات کو برابر والے کمرے میں تیری بیوی، تیرے پاس تھی۔لیکن میں تو جاگ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تیرے غلام نے اُدھر ایک کنکرا اچھالا اور جب تو گہری نیند سو گیا تو تیری بیوی تجھے وہیں سوتا چھوڑ کر، چھپّر تلے، اس حبشی کے پہلو میں آ گئی، تُو سو رہا تھا اور وو دونوں غیر حالت میں تھے۔تب میں نے تیرے گھر کے صحن سے اس گھوڑی کو کھولا۔(۷)

غیرت مند ابی طاہر اپنی بیوی اور نوکر کے بارے میں ایسے جملے سن کر ہمت اور حوصلہ ہار بیٹھا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق اور نوکر حبشی کو قتل کر کے انجام تک پہنچاؤں گا۔ یوں ابونواس ناحق ایک انسانی قتل کا گناہ سر لیتا ہے اور دوسرا ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑنے کا باعث بنتا ہے جس کا انجام ابونواس کو یوں بھگتنا پڑا کہ شادی کے تیسرے روز ہی اس کی محبوبہ خون تھوک تھوک کر مر گئی اور ابونواس تا حیات پاگل پنے کی زندگی گزارتا ہے، اسے احساس ہو جاتا ہے کہ اس کے فکر و فریب کی سزا اسے مل رہی ہے مگر تب تک پانی سر سے گزر چکا تھا۔اس حوالے سے فضیل جعفری کا کہنا ہے۔

> مرزا حامد بیگ نے بڑی فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ مکر و فریب کے ذریعے حاصل کی جانے والی خوشی یا لذّت کی عمر نہ صرف بہت مختصر ہوتی ہے بلکہ وہ متعلقہ شخص کو خوف اور احساسِ جرم کے جہنم میں جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔(۸)

''مٹی کا زنگ'' کا مرکزی کردار ایک مردہ شخص ہے جو اسٹیشن پر لاوارث پڑا ہوا ہے لیکن وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔ یہ استعارہ ہے ان بے ضمیر لوگوں کا جو اس دنیا میں بے بس اور کمزور لوگوں کو دیکھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں اور اس قدر خود غرض و بے ضمیر ہو گئے ہیں کہ ایک مردے تک کو نظر انداز کر کے گزر جاتے ہیں، گویا مذہبی و تہذیبی تمام قدریں نیست و نابود ہو چکی ہیں۔''مٹی کا زنگ'' میں ایسے پورے سماج پر طنز ہے، جہاں کے لوگ پوری طرح ایک دوسرے سے لاتعلق اور بے حس ہو چکے ہیں۔ ان کے

اندر انسانیت کی اتنی بھی رمق باقی نہیں رہ گئی کہ دو چار افراد یکجا ہو کر کسی مردہ شخص کی لاش کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کر سکیں۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کے اس ماحول میں یہ لوگ خود چلتی پھرتی لاشوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ تہذیبی اقدار ہی نہیں، مذہبی اقدار کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔(۹)

مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں مغل تہذیب کی شکست و ریخت کی عکاسی علامتی پیرائے میں ملتی ہے۔ ''مغل سرائے'' ان کا بہت مقبول افسانہ تہذیبی زوال کی عمدہ پیش کش ہے۔ افسانے کی بنت خواب اور حقیقت پر رکھی گئی ہے جس میں تہذیبی بے یقینی کی کیفیت نمایاں ہے۔ افسانے میں ہمارے گزشتہ شاہانہ طرزِ زندگی کی یادیں بھی تازہ کی گئی ہیں اور کس طرح انگریزوں کے تسلط کے بعد مغل تہذیب اپنی شناخت کھو بیٹھی، اس کی عکاسی بھی افسانے میں علامتی انداز میں ''بھیڑیوں'' کے گھس آنے کے طور پر کی گئی ہے۔ ایک وقت میں مغل تہذیب مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ تھا، مگر انگریزوں نے اس خطے میں تجارت کی غرض سے آ کر یہاں کی معاشرت کی تخلیقیت میں جمود طاری کر دیا اور یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ اس نسل کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

حضور، مغل سرائے کی انتظامیہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے پر سخت نادم ہے۔ ہم خود حیران ہیں کہ پائیں باغ اور اس سے ملحقہ علاقے میں جانے کیسے سچ مچ کے بھیڑیوں اور گیدڑوں کی ٹولیاں در آئی ہیں۔ حضور آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں، مرحومہ کی مٹی عزیز کرنے کے لیے ہمارے عملے کو آپ بہت جلد سرگرم عمل دیکھیں گے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہو گی کہ آپ کے نقصان کی تلافی...

ادھر سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں دبیز سرخ قالین پر دو سفری تھیلے رہ گئے تھے اور ان کے قریب ہی چاندی کی اونچی سماوار، جس کے نیچے راکھ اڑ رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے جوں کے توں قرینے سے سجے رکھے تھے۔(۱۰)

افسانے کے اختتام پر سرخ قالین پر دو سفری تھیلوں کا باقی رہ جانا اور باقی تمام اشیا کا جوں کا توں رہنا گویا مغلیہ معاشرت کے انہدام کے بعد چند باقیات پیچھے رہ جانے کو بڑی عمدگی سے استعاراتی انداز میں افسانہ نگار نے بیان کیا ہے۔

''بابے نُور محمدے کا آخری کَبت'' بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں وہ اپنے بچپن کی کہانی سناتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک دفعہ وہ چار وقتوں سے بھوکا تھا جبکہ آس پاس بڑی حویلیوں میں مال و دولت کی بہتات تھی۔

''چھوٹے ہوتے کا قصہ ہے، مجھے لگی ہوئی تھی بھوک، پورے چار وقتوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

...ایسا بھی نہیں تھا کہ قحط پڑ گیا ہو۔سارے میں، رجے پجے گھر آباد تھے،خمبوں میں بھرے خراب ہوتے ہوئے اناج کی بساند یہاں تک آ رہی تھی۔ ہر دروازے پر لیاری بندھی تھی،سب گھروں سے باہر نکلتے وقت حویلی کے اونچے دروازوں سے گردن نیوڑھا کر گزرتے تھے،سب کے سروں کے شملے مایا لگے تھے،اکڑے ہوئے، اور بھلیا لوکا،جھوٹ کہہ کر اپنی گور کیوں بھاری کروں، مجھ پر پورے چار ویلے گزر گئے تھے۔(۱۱)

افسانے میں جن بابا نور محمد جب یہ بتاتا ہے کہ صاحبِ جائیداد کے چاندی سے لدے گھوڑوں سے گرتی چاندی جمع کر کے پورا پورا توڑا اکٹھا کر لیتے تھے اور پھر اکثر ہم چار چار وقتوں کے بھوکوں نے اس چاندی کے توڑے سے صرف ایک روٹی خریدی تو اس سماج کے کریہہ نظام سے گھن آنے لگتی ہے۔

منافقت ایک ایسا طرزِ عمل ہے جس میں قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے، انسان ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہوتا ہے۔منافقت کا بیج ہر دور میں انسانی سرشت میں چلا آ رہا ہے اور معاشرتی اعتماد و اعتبار کی جڑوں کو کھوکھلا کرتا آ رہا ہے۔ زوال پذیر معاشروں میں اعلیٰ طبقے کے کردار تو پوری طرح منافقانہ طرزِ عمل سے نچلے طبقے کے حقوق پر غاصبانہ حملہ کر کے ان کے جائز حقوق اور مقام سے محروم کرتے چلے آ رہے ہیں۔''کہانی کا بڑھاپا'' میں مرزا بہادر کا کردار اسی اعلیٰ طبقے کی منافقت کی ایک مثال ہے جو اپنے نوکروں کی لڑکیوں پر اپنا حق جتاتے ہوئے ناجائز اولاد کو جنم دیتے ہیں اور پھر تمام عمر اس گناہ کو جھوٹ کے لبادے میں چھپاتے چھپاتے گزار دیتے ہیں۔

نواب بیگم اور مرزا بہادر کی سفید بھنویں ان کے ڈھیلے پپوٹوں پر جھک آئی ہیں اور چھوٹے مرزا کی کنپٹیوں سے سفید بال اتر کر ان کی ریشمی داڑھی میں بہت دور تک نکل گئے ہیں۔صرف ایک بار،رات کے ایک پہر کے لیے ان معمولات میں فرق آیا تھا اور اس کے بعد سب کچھ حسب معمول ہے... ابھی کچھ دیر پہلے پری چہرہ لڑکیوں کا ذکر چھڑا ہے۔نوکر چاکر تھر تھر کانپنے لگے ہیں...(۱۲)''گمشدہ کلمات'' میں فیکا کاکا ایک ایسا کردار ہے جس کی معاشرے میں، باپ نہیں صرف ماں کے حوالے سے پہچان ہے۔یہ ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے جس میں جاگیردارانہ طبقہ معاشی استحصال کے ساتھ ساتھ جنسی جبر و تشدد بھی مسلسل روا رکھتا ہے۔افسانہ اسم بامسمیٰ ہے، افسانے کا نام ہی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ فیکا کاکا کے ذریعے گمشدہ آوازوں کی بازیافت کی جا رہی ہے اور یہ ایسی آوازیں ہیں جو جاگیرداروں کی بڑی بڑی حویلیوں کے کونے کھدروں میں دفنا دی جاتی ہیں اور مظلوم عورتیں بے چاری تا حیات ایک عجب خاموشی کاٹ کاٹ کے بالآخر دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں اور ان خواتین کے بچے ساری زندگی سوالیہ نشان بنے انھی حویلیوں میں جاگیرداروں کے جوتے سیدھے کرتے ہوئے اپنی شناخت کی تلاش میں گزار دیتے ہیں۔فیکا کاکا کی والدہ بھی ایسے ہی جنسی استحصال کا شکار رہی اور فیکا کاکا اپنی شناخت کو

کھوجتے کھوجتے عمر گزار دیتا ہے۔ آج بھی اسے مرزا مغل بہادر اپنے گھر گاؤں کے تمام مردوں کے ساتھ دعوت پر بلاتا ہے اور اسے اپنی زندگی کی کہانی دوبارہ سنانے پر اصرار کرتا ہے، ایسی کہانی جسے سنا کر فیکا کا کا سخت اذیت سے گزرتا ہے مگر وہ مرزا صاحب کو انکار نہیں کر سکتا اور مرزا مغل کو اس کی داستان سن کر اپنی مردانگی پر فخر محسوس ہوتا ہے اور اس کی انا کو تسکین ملتی ہے۔

> حضور، میں عیش باغ کی تمام راہداریوں کے نام نہیں گنوا سکتا، البتہ اس میں سے ایک گمنام میری اپنی ماں تھی... اس کے پھر تیلے انگ نے جب جوانی کی پہلی انگڑائی توڑی ہے تو خدا مغفرت کرے بڑے مرزا مغل بہادر نے اسے اکیلے میں دوسری انگڑائی نہیں لینے دی۔ اس کے پیروں کے نرم سبھاؤ اسی گھر میں اپنی معصومیت گم کر بیٹھے... فیکے کا کا کی آنکھیں مندھی ہوئی تھیں اور اس کی آواز دھیرے دھیرے ڈوب رہی تھی۔ وہ بیتے ہوئے زمانوں میں غوطہ لگا گیا تھا۔ اسے بے کراں وسعت کا سامنا تھا... (۱۳)

جاگیرداروں کو اپنا نظام چلانے کے لیے صرف حکم چلانا اور عمل کرانا پسند ہوتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعے افسانہ نگار معاشرے کے ان بے رحم کرداروں کو بے نقاب کرتے ہیں جو اپنا شملہ اونچا رکھنے اور عزت کو داغدار ہونے سے بچانے کے لیے دوسرے کئی انسانوں کی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔

> جاگیردارانہ نظام میں معاشی استحصال ہمارے اخلاقی اور تہذیبی گراوٹ کی انتہائی مکروہ صورت ہے۔ انھوں نے زوال پذیر جاگیردارانہ ماحول کی اچھی عکاسی کی ہے اور اس میں جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ (۱۴)

افسانہ ''اینگلو انڈین لڑکی کی کہانی'' میں گوری مغرب کی گھٹن زدہ اور مشینی زندگی سے بیزار ہو کر مشرق کی سیاحت کو آتی ہے۔ وہ بچپن سے سنتی آ رہی تھی کہ مشرق کی زمین مقدس ہے اور یہاں احترامِ انسانیت اور قدروں کی پاسداری کی جاتی ہے۔ لہٰذا مغرب سے بیزار ہو کر مشرق کی دھرتی پر کچھ وقت سکون سے گزارنے کے لیے آتی ہے مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ گھٹن اور شر مشرق میں بھی اسے اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ مرزا نے اس کے اعتبار کو پاش پاش کر دیا۔ مرزا پہلے تو گوری کی مختلف ممالک میں سیر و سیاحت کی داستان سن کر اسے شک کی نگاہ سے دیکھتا رہا اور پھر موقع پاتے ہی اپنا گھناؤنا وار کر دیتا ہے۔

> گوری نے مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی طرف نگاہ کی۔ ایسے میں اچانک مرزے نے اسے اپنی مضبوط بانہوں میں بھر لیا۔ پتہ نہیں یہ سب کیسے ہوا، مغلوں کی نزول اولاد اپنی سنہری مونچھوں میں مسکراتی رہی... (۱۵)

گوری کا کردار مغلوں کی اولاد کے ہاتھوں اپنی عصمت کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ جاتے ہوئے گوری ایک خط چھوڑ گئی جو کہ مشرقی سماج کی اخلاقی پستی کو سامنے لاتا ہے۔

میں نے غلط پڑھا اور جھوٹ سنا تھا کہ مشرق اور اس کے باسی مغرب والوں سے مختلف ہیں۔مرزے تم میں اور جان میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے لاہور، دہلی اور لکھنؤ نہیں جانا۔ میں یہیں سے پلٹ رہی ہوں...(۱۶)

متبدل سماج میں ہونے والے مسائل کی سچی اور حقیقی تصویریں پیش کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔مرزا حامد بیگ نے سماج میں پیش آنے والے دلدوز واقعات کو پوری حقیقت پسندی سے اپنے افسانوں میں سموکر گہری بصیرت کا ثبوت دیا۔

مرزا حامد بیگ کے افسانوی ادب میں آج بھی ندرت اور تنوع کی جو جلوہ سامانیاں ملتی ہیں اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کا تخلیقی مزاج بیک وقت نو کلاسیکی بھی ہے اور جدید بھی۔وہ انسانی معاملات میں تصور پرست بھی ہیں اور سفاکانہ حد تک حقیقت پسند بھی...(۱۷)

معاشرہ بظاہر ترقی کی منازل طے کر رہا ہے مگر اخلاقی طور پر گراوٹ کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔انھوں نے بڑی ہنرمندی سے سطحی ذہنیت کے حامل اس معاشرے کے تنگ نظر لوگوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔

ستر کی دہائی کے منطقے میں معاشرتی انہدام کے جن پسے ہوئے انسانوں کو افسانوی کرداروں کے روپ میں مرزا حامد بیگ نے پیش کیا وہ ہر عہد میں پائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار ماضی، حال اور مستقبل میں سفر کرتے ہیں۔ وہ سماج میں بدلتی ہوئی اقدار کی صورت حال سے بخوبی آگاہ تھے اور انھیں منفرد انداز میں اپنے افسانوی پیرائے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ بدلتے سماجی تناظر میں ان کی افسانوی فضا اپنے عہد کی سچی اور حقیقی تصویریں سامنے لاتی ہے۔

حواشی

(۱) مظفر علی سید، (مزامیر) گمشدہ کلمات، مشمولہ گمشدہ کلمات از مرزا حامد بیگ، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص ۷

(۲) مرزا حامد بیگ، اردو ادب کی شناخت (تنقید)، (لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۷

(۳) ڈاکٹر فوزیہ اسلم، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۳۷

(۴) جیلانی کامران، (دیباچہ)، گناہ کی مزدوری از مرزا حامد بیگ، (راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۹۱ء)، ص ۸

(۵) مرزا حامد بیگ، مرزا، گمشدہ کلمات، محولہ بالا، ص ۸۷

(۶) اعجاز راہی (ابتدائیہ) مشمولہ گواہی از اعجاز راہی، (کراچی: ناظر پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۸ء)، ص ۵

(۷) مرزا حامد بیگ، جانکی بائی کی عرضی، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۳۰

(۸) فضیل جعفری، (دیباچہ)، جانکی بائی کی عرضی، محولہ بالا، ص ۲۵
(۹) ایضاً، ص ۲۱
(۱۰) مرزا حامد بیگ، مرزا، گمشدہ کلمات، محولہ بالا، ص ۳۷
(۱۱) ایضاً، ص ۱۵۹
(۱۲) ایضاً، ص ۱۵۱-۱۵۴
(۱۳) ایضاً، ص ۸۵-۸۲
(۱۴) ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان، اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ (۱۹۴۷ء کے بعد)، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶ء)، ص ۲۲۳
(۱۵) مرزا حامد بیگ، گناہ کی مزدوری، (راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۶۷-۱۶۸
(۱۶) ایضاً
(۱۷) فضیل جعفری، (دیباچہ)، جانکی بائی کی عرضی، محولہ بالا، ص ۲۵

مآخذ:

(۱) اسلم، فوزیہ، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء
(۲) بیگ، حامد، مرزا، اردو ادب کی شناخت (تنقید)، لاہور: اورینٹ پبلشرز، ۲۰۰۷ء
(۳) ____، جانکی بائی کی عرضی، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء
(۴) ____، گمشدہ کلمات، ۲۰۰۲ء، ____
(۵) ____، گناہ کی مزدوری، راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۹۱ء
(۶) راہی، اعجاز، گواہی، کراچی: ناظر پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۸ء
(۷) خان، نگہت ریحانہ، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ (۱۹۴۷ء کے بعد)، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶ء